

عزراچی سو گیا ہے

نصیر احمد ناصر

PDFBOOKSFREE.PK



زمین کے نام
جو ابتداً تمام پانی تھی

زمیں زادے!
تجھے تو کچھ دکھائی بھی نہیں دیتا
سقاوہ کب سے خالی ہے
نہ اوپر ابرِ باراں ہے
نہ اب زیرِ زمیں
آبِ بقا ہے
عالمِ فطرات غائب ہے
نباتاتی تبسم کھو گیا ہے
تا بکاری خواہشوں کا بول بالا ہے.....

ترتیب

ابتدائی:

۱۱	لامحدود سمتوں کا اقلیدس نظمیں (۱۹۹۰ تا ۲۰۰۰ء)
۱۵	خلاؤں کی اسیری دُعا
۱۷	زینے والا
۱۸	ہوا پھر رخصتی کے گیت گاتی ہے
۱۹	چُنڈھا
۲۱	لائٹ ہاؤس
۲۲	کھڑکیاں
۲۷	مرگ پیچ
۳۰	طلسمِ ماد
۳۱	عراچی سو گیا ہے
۳۳	کلابہ ٹوٹنے کی دیر ہے
۳۵	لال پکا
۳۷	ساگر دیوتا

شاعری تاریخ کے جبر سے آزاد ہوتی ہے۔ تاریخ اپنے موڑ مڑتی رہتی ہے اور اچانک کہیں پیادوں کے ازدحام یا گھوڑوں کے سُموں سے اٹھنے والے گردِ باد میں گم ہو جاتی ہے۔ لیکن شاعری چلتی رہتی ہے..... تاریخ کے بیانیے سے بے نیاز، ماقبل اور مابعد سے بے خبر۔ جو لوگ معاصر اردو شاعری پر عمیق اور اذوق نگاہ رکھتے ہیں، وہ اچھی طرح جان سکتے ہیں کہ اردو شاعری کی تاریخ اور اردو نظم اب ایک دورِ راستے پر اپنے اپنے موڑ مڑ رہی ہیں۔ پچھڑاؤ کے اس خود زائے مگر ناقابلِ تردید مرحلے پر (ادب کی) تاریخ سست رہے، ٹھہراؤ اور جماؤ کا شکار ہے۔ اس لیے کہ تنقید اور تاریخ کے بیانیے ہمیشہ تخلیقی و فور سے عاری ہوتے ہیں اور چلنے کی بجائے انصافوں میں رہنا، لائبریریوں میں محفوظ ہونا اور عجائب گھروں میں حنوط ہونا پسند کرتے ہیں۔ لیکن نظم چلتی رہتی ہے اپنی اتنت دھارا میں۔ تاریخ اس کے راستے کا پتھر نہیں بن سکتی۔ ہاں اس کی انقلاب آفریں سیال رو تاریخ کو ضرور بہا کر لے جاسکتی ہے۔ آج کی اردو نظم بھی تاریخ ادب کی نوآبادی اور نقادوں کی قلمرو سے باہر نکل کر شعروادب کے گلوب میں خطِ آزادی تحریر کر رہی ہے۔ (نصیر احمد ناصر)

۸۶	مسافر راستوں سے لوٹ آتے ہیں	۳۹	بلیو مومن
۸۸	اب جان کر کیا کرو گے؟	۴۱	البعادیت
۹۰	روشنی تیرے جنم یگ پر ایک نظم!	۴۳	لائٹ کونز
۹۲	روشنی تمہارے لیے ایک اُداس نظم!	۴۵	سنو بلیک ہول جیسے آدمی!
۹۴	رقصِ عمر میں وصال	۴۶	سٹی ہائٹس
۹۶	اگر اس خواب کی وحشت سے بچنا ہے	۴۹	مہمان پرندوں کو الوداع
۹۸	حصارِ جسم سے باہر ایک گیت	۵۱	امیگریشن
۹۹	بک مارک	۵۳	ویپ ہولز
۱۰۲	باسٹرڈز	۵۵	سفید بادل
۱۰۳	سُنْدُس	۵۷	درِ ناواپسی
۱۰۴	میرے ہاتھ مری آنکھیں ہیں	۵۹	دیکھ سکتے ہو تو دیکھو!
۱۰۵	شکستِ خواب میں پسپائی	۶۱	تاریخ سے باہر ایک آدمی
۱۰۶	بلیک وڈو	۶۴	بارش کیسے لائیں؟
۱۰۷	بے کراں دکھ کی مسافت	۶۷	بصارت کا قحط
۱۱۰	اُروشی نے سچ کہا تھا	۶۹	ایک نیا اطلانتہ گم ہونے والا ہے
۱۱۲	محبوب خواہش کا خمیازہ	۷۴	اے مرے خواب کہاں جائے گا!
۱۱۴	کچھ کتبوں پر نام نہیں ہوتے!	۷۶	اجنبی کس خواب کی دنیا سے آئے ہو!
۱۱۶	تجھے کس عہد میں ڈھونڈوں؟	۷۸	سفرِ مجھ کو صدائیں دے رہا ہے
۱۱۸	کہانی ٹوٹ کر مربوط ہوتی ہے	۸۱	یہاں تو وہی خواہش اب ہے
۱۲۰	گردِ نامہ	۸۴	ابد کے اُس طرف بھی فاصلے ہیں

لامحدود سمتوں کا اقلیدس

میری نظر میں شاعری ارضی راستوں کو سماوی فاصلوں میں طے کرنے کا نام ہے۔ کبھی کبھی یہ فاصلے اتنے پھیل جاتے ہیں کہ مروج زمینی پیمانے انھیں ناپنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ لمحہ یا مقام ہوتا ہے جہاں آ کر تخلیق کار چپکے سے وقت کی لائٹ کونز (Light Cones) میں داخل ہو کر بیک وقت تینوں زمانوں میں جینے لگتا ہے اور اس ماورائی کیفیت میں وہ زبان کے ایسے انوکھے اور نئے سانچے وضع کرتا ہے جن میں ڈھل کر الفاظ فکری اور جمالیاتی امتزاج کا اعلیٰ وارفع پیکر بن جاتے ہیں۔ پیش کش کے اعتبار سے شاعری کی مثال اس Finished Product کی طرح ہے جس کے خام مواد کو شاعر اپنے داخل کی ریفائنری (Refinery) میں نہایت پیچیدہ عمل سے گزارتا ہے۔ اسے آپ Sublimation بھی کہہ سکتے ہیں۔ محسوسات کی سطح پر شاعری ایک ناقص سچائی ہے، اصل کا محض دھندلا سا عکس اور بعض حالتوں میں قول محال یا متناقض بالذات یعنی Paradox۔ پورا سچ کون لکھ سکتا ہے! اور پورا دکھ کون بانٹ سکتا ہے! شاعری کی شاریات میں راست گنتی کی بجائے علامتوں، دائروں اور قوسوں کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُسے ناپنے، جانچنے، پرکھنے کا کوئی حتمی کلیہ موجود نہیں۔ تاہم غلط اور صحیح، اچھی اور بُری، معیاری اور غیر معیاری اور سچی اور جھوٹی شاعری کے بیچ، چند وضع کردہ بنیادی اصولوں یا پیمانوں کے علاوہ بھی کوئی نہ کوئی

۱۲۱	ہم نے کب تجھ کو یاد کیا!
۱۲۲	پسپائی
۱۲۶	چلو اک خواب دیکھیں!
۱۲۸	جنم جنم کا گیت
۱۳۰	تیسری دُنیا
۱۳۲	وقت کی بدرو میں گرتے خواب
۱۳۴	غبارہ
۱۳۶	تسطیر
۱۳۸	POSSESSOR
۱۴۰	محبت
۱۴۲	گیٹ-۲۳
۱۴۵	چالیسویں سالگرہ پر ایک غیر رسمی نظم
۱۴۷	دکھ تو سارے میرے تھے
۱۴۹	خواب کا چہرہ نہیں ہوتا
۱۵۱	نظمیں زندہ رہتی ہیں!

حدِ فاصل ضرور ہوتی ہے اور آفاقی سچائیوں کے راستے کہیں اسی حدِ فاصل سے پھوٹتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ سچی اور معیاری شاعری وہ ہے جس میں آفاقیت ہو۔ لیکن یہ بات بھی Side Light کی طرح ہے اور صرف ایک حد تک یا ضمنی طور پر درست ہے Ultimate Principle نہیں۔ دوسری بات یہ کہ شاعری محض چند اوزان و بحر کی پابندی کا نام نہیں، یہ تو لاتعداد اور لامحدود سمتوں کا اقلیدس ہے۔ اس کا اپنا علامتی و استعاراتی اور فکری و ثقافتی نظام ہوتا ہے پیکر تراشی ہوتی ہے اسرار و رموز کی محسوسات کی ایک انوکھی دنیا ہوتی ہے جو بیک وقت فرد و سماج اور کائنات کے ظاہر و باطن سے منسلک ہوتی ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کی لہر میں شاعری کئی اطراف میں سفر کرتی ہے۔ اس کا کوئی ایک نقطہ اتصال تلاش کرنا، معیار کے کسی ایک ثقہ سانچے میں ڈھال کر کوئی حتمی تعریف بیان کرنا میرے خیال میں ناممکن ہے۔ شاعری ہمیشہ ہی سے انسان کے اندر موجود ہے۔ اظہار کی سطح پر یہ کب اور کیسے الفاظ کا روپ دھار لیتی ہے یہ ہر شاعر کا انفرادی زائیدہ ہوتا ہے۔

نصیر احمد ناصر

”حالی سے اقبال تک فارم اور فریم، عروض و آہنگ سے متعلق تصور پر ضرب ڈر ڈر کر لگائی جاتی رہی مگر اقبال کی نظم نگاری کے بعد حالات بڑی تیزی سے بدلے۔ فیض، ان م راشد اور اختر الایمان کے عہد میں نظم کی ہیئت میں بہت ٹوٹ پھوٹ ہوئی، پھر ابتری پھیلی۔ نظم میں کیا کہا جا رہا ہے، کچھ پتالگانا مشکل ہو گیا۔ مگر کچھ لوگوں نے واقعہ بدلتے سماج، عدیم الفرستی، سائنسی ترقیات، صارفیت کے جبر کو محسوس کیا اور نظم کو نئے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا شروع کیا اور اپنی الگ پہچان بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ ہندوستان میں اختر الایمان اور پاکستان میں اس ضمن میں مجید امجد اور نصیر احمد ناصر کا نام لیا جاسکتا ہے۔“

(استعارہ، ستمبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۷۹، ۲۸۰)

خلاؤں کی اسیری میں دُعا

خداوند!

میں اک لمحہ تری بے انت صدیوں کا

مری یہ عمر تیرے وقت کی کترن ہے

نیلا آسماں از لولوں سے تیری نیند کی تقدیس ہے

تورات کے دل میں

ستاروں کے ابد روشن کیے بیٹھا ہے

آوازیں تری خاموشیوں کی گنگناہٹ ہیں

تو نغموں کا سمندر ہے

کراں سے تا کراں پھیلی اداسی کا مداوا ہے

مگر میری زمینوں کے مقدر میں

نصیر احمد ناصر کی نظموں میں مشاہدہ، تجربہ، موضوعیت، معروضیت، مکانیت، لامکانیت، زمانیت، لازمانیت، تشبیہات، استعارے، علامتیں، سمبلز سبھی نظر آتے ہیں۔ ان نظموں کی سب سے بڑی صفت زبان کا فن کارانہ استعمال ہے جو منطقی ہوتے ہوئے بھی برجستگی اور معنویت کا بھرپور تاثر دیتی ہے۔ شاعر نظموں کے عنوان، موضوع، متن اور ان کے برتنے میں بڑے تنوع اور اختراع پسندی سے کام لیتا ہے۔ یہ نظمیں قاری کو اپنی گرفت سے آزاد ہونے کا موقع نہیں دیتیں اور قرأت کے بعد قاری کے احساسات پر چھائی رہتی ہیں۔ نصیر احمد ناصر کی نظموں میں ہم صوت اور خوش صوت لفظوں کے استعمال سے ایک غنائی کیفیت ملتی ہے۔

(ڈاکٹر فہیم اعظمی، اوراق، جولائی ۱۹۹۶ء)

خلاؤں کی اسیری ہے
 انھیں آزاد کر دے
 کائناتی فاصلوں کی تیرگی میں روشنی بھر دے
 مجھے بے انت کر دے.....!!

زینے والا

زینے والا
 ازلوں کی چُپ سادھے
 اپنے ابد کی بے اندازہ اُونچائی سے
 وقت کا ایک مدور لمحہ
 ہر جانب لڑھکا کر
 سیڑھی سیڑھی
 دیکھ رہا ہے
 پاتال کے پاپی کنویں میں
 اُس کی کھٹ کھٹ کرتی
 صدیاں گونج رہی ہیں!!

چُنڈھا

اگر کوئی اچانک روشنی کر دے
تو کیا تم دیکھ پاؤ گے؟
وہ سب چیزیں
جو تاریکی کے گہرے اُسودی
محلول میں گم ہیں
سراپا زندگی کا
موت کا چہرہ
اُداسی کا بدن
آواز کے لب
درد کے ڈمپل

ہوا پھر رُخصتی کے گیت گاتی ہے!

مجھے کس رات کا سایہ ڈراتا ہے
مجھے کس خواب کی نیندیں جگاتی ہیں
مجھے کس یاد کا چہرہ رلاتا ہے
مری آنکھوں کے رستوں میں
نہ جانے کون سے لمبے سفر کی دھول اُڑتی ہے
مجھے کس دیس کی مٹی بلاتی ہے؟

لائٹ ہاؤس

بتا میری آنکھوں کی ازلوں میں ٹھہرے ہوئے نم!
 تجھے کن زمانوں کی نیندوں نے گھیرا ہوا ہے
 کسی درد کی سرزمین پر
 خدا بارشیں رورہا ہے
 کہیں ایک آنسو مرا
 اُس کی پلکوں پہ کیوں رُک گیا ہے

بتا ساحلوں کی ہوا!
 کون سے شہر میں وہ مرا راستہ دیکھتی ہے

خوشی کے مرمریں پاؤں
 محبت کی حنائی انگلیاں
 آفاق زلفوں کے
 خدا کا سرمدی سایہ.....

اگر کوئی اچانک روشنی کر دے
 تو کیا تم دیکھ پاؤ گے
 ابد کی دھند میں لپٹی
 ازل سے منتظر
 آنکھیں کسی کی.....؟

وہ جس نے سمندر کے بھیگے سفر میں کہا تھا
محبت جزیرہ ہے، دکھ بادباں ہے

بتا مجھ کو اسمِ رہائی
میں رسمِ جدائی ادا کر کے
سنگیں ستونوں کی لمبی قطاروں میں
اُس سے ملوں گا
اُسے بازوؤں میں سمو کر
فقط ایک بوسے کے بدلے
زمینوں کی ساری مسافت اُسے سوئپ دوں گا

بتا روشنی کے نشاں!
پانیوں میں چھپی
سربریدہ چٹانوں کی آبی شیبہیں
ابد کے کناروں پہ سوئی ہوئی
بوڑھی صدیوں کی تجرید ہیں
یا کسی داستانی سفر میں
جہازوں کے چپو چلاتے

غلاموں کی بے عکس چیخوں کی تجسیم ہیں
وقت کی (شام کی) آخری حد پہ اُڑتے طلسمی پرندے
بتا وہ کہاں ہے
جسے یاد کر کے
عقبتی صداؤں کے مستولِ دل میں اُترنے لگے ہیں
بتا اے زمینی ستارے!
مسافر ترے خواب کیوں دیکھتے ہیں؟

زُباں بندی کے دن بے داد کی راتیں، ستم کے دور سہتی ہیں

کھڑکیاں صدیوں کے خوابوں کی کہانی ہیں
فصیلوں، آنگنوں، اُجڑے مکانوں کی گواہی ہیں
ازل سے وقت کے جبری تسلسل میں
تھکن سے چرچراتے زنگ آلودہ زمانوں کی گواہی ہیں

کھڑکیاں عورت کا دل رکھتی ہیں
خوشبو، دھوپ، بارش، چاند کی کرنیں
ہوا کے ایک جھونکے سے
بدن کے موسموں پر کھول دیتی ہیں
اُڑا کر کاغذی پیکر
انوکھی خواہشوں میں زندگی کو رول دیتی ہیں

کھڑکیوں کے سامنے جب تتلیاں پرواز کرتی ہیں
تو شیشوں سے لگی آنکھوں میں یادوں کی
دو پہریں بھیگ جاتی ہیں
سفید و سُرخ پھولوں سے لدی بلیں

کھڑکیاں

کھڑکیاں منظر دکھاتی ہیں
دلوں کی ہوں، دماغوں کی کہ آنکھوں کی
وہ باہر کی طرف کھلتی ہوں یا اندر کی جانب،
روشنی اُس پار کی اس پار لاتی ہیں

کھڑکیاں باتیں بھی کرتی ہیں
لبوں کے قفل ابجد کھولتی ہیں
کھڑکیوں پہ رات جب تاریکیوں کے جال بُنتی ہے
تو عمریں درد کی پاتال سے سرگوشیوں میں بولتی ہیں
کھڑکیاں خاموش رہتی ہیں

انہیں جب ڈھانپ لیتی ہیں
تو شا میں خوبصورت اجنبی لوگوں کا رستہ دیکھتی ہیں
مٹھیوں میں جگنوؤں کا لمس بھرتی ہیں

مرگ پیچ

کھڑکیاں اکثر کھلی رہنے کی ضد کرتی ہیں
نیلا آسماں بادل پرندے دیکھ کر حیران ہوتی ہیں
ہمیشہ بند رکھنے سے

انہیں کمروں کی دیواروں کی سانسیں ٹوٹنے کا خوف رہتا ہے
مکینوں کے چلے جانے پہ ڈرتی ہیں
انہیں بھی زندگی ویران لگتی ہے اُداسی کاٹنے کو دوڑتی ہے
کھڑکیاں انسان ہوتی ہیں !!

مجھ کو اپنی موت کی خوشبو نے پاگل کر دیا ہے
دوڑتا پھرتا ہوں
سارے کام نپٹانے کی جلدی ہے.....
پہاڑوں اور جھیلوں کی خموشی سے
قدیمی گیت سننے ہیں پرانے داستانی بھید لینے ہیں
درختوں سے نموکاری کی بابت پوچھنا ہے
نت نئی شکلیں بناتے بادلوں کو دیکھنا ہے
خوش نوا اچھے پرندوں سے
اڑن پھل کا پتا معلوم کرنا ہے
عروسی بیل کے پھولوں کو چھونا ہے

درود یوار سے باتیں بھی کرنی ہیں
 ابھی کتنے ملاقی منتظر ہیں
 ایک لمبی لسٹ ہے آنکھوں میں نادیدہ نظاروں کی
 فشارِ خون بڑھتا جا رہا ہے
 اب کسی لمحے رگیں پھٹنے کا خطرہ ہے
 مگر مصروف ہوں، سب کام نپٹانے کی جلدی ہے.....
 سمندر نے بلایا ہے
 جزیرے اور ساحل بھی
 کئی قرنوں سے مجھ کو یاد کرتے ہیں
 مچھیرے گیت گاتے، بستیوں کو لوٹتے
 مجھ کو بہت ہی ہانٹ کرتے ہیں
 کسی دن جاؤں گا ملنے.....
 خزانوں کو اگلنے کے لیے
 بے تاب ہیں رقبے طلسمی سرزمینوں کے
 سفر کے راستے معلوم ہیں
 نقشے پرانے کاٹھ کے صندوق میں محفوظ ہیں سب
 دیوبانی بھی سمجھتا ہوں
 مگر مصروف ہوں.....

بچوں کے کتنے کام باقی ہیں
 کتابیں، کاپیاں، اسکول کے کپڑے، نئے بستے
 کھلونے، بیٹ، ریکٹ
 اور بہت سی ان کہی چیزیں
 خریدوں گا تو خوش ہوں گے
 مگر مصروف ہوں، سب کام نپٹانے کی جلدی ہے.....
 رگوں میں خون کی رفتار بڑھتی جا رہی ہے
 زندگی پر اک جنونِ مرگ طاری ہے
 بہت مصروف ہوں
 سرپٹ لکھے جاتا ہوں نظمیں
 مجھ کو اپنی موت کی خوشبو نے پاگل کر دیا ہے!!

عراپچی سو گیا ہے

عراپچی سو گیا ہے
 طولانی فاصلوں کی
 تھکن سے مغلوب ہو گیا ہے
 خبر نہیں ہے اُسے کہاں ہے
 بس ایک لمبے کٹے پھٹے
 ناتراش رستے پہ چوبی گاڑی
 ازل سے یونہی
 ابد کی جانب رواں دواں ہے
 ذرا سے جھٹکے سے
 چرچراتی ہے جب

طلسمِ ماہ

عجب دیواری
 اُٹھتی چلی جاتی ہے رستے میں
 نہ کوئی بات ہونٹوں پر
 نہ کوئی خواب آنکھوں میں
 نہ کوئی یاد سینے میں
 نہ کوئی چاند اصلی بُرج کے رُخ پر
 نہ کوئی اسم خوابیدہ کتابوں میں
 نہ کوئی پھول خوشبو حُرف بستے میں
 عجب دیواری
 اُٹھتی چلی جاتی ہے رستے میں !!

تو بوسیدگی کی لاکھوں تہوں میں لپٹا
 ہر ایک ذی رُوح چونکتا ہے.....
 عراقچی خواب دیکھتا ہے
 وہ شاہزادی کا ہاتھ تھامے
 سنہری رتھ میں سوار ہو کر
 عجب جہانوں میں 'شہزادانوں میں
 کھو گیا ہے
 عراقچی سو گیا ہے!.....!

کلابہ ٹوٹنے کی دیر ہے

ابھی تکلے پہ دھاگا گھومتا ہے
 ابھی کر لے سکھی باتیں
 طلسم خواب کی گھاتیں
 ابھی دو چار ہی راتوں کا قصہ ہیں
 دیے کی ٹمٹاتی لو میں کوئی آنکھ
 چہرے پڑھ رہی ہے
 زندگی کی سمت
 مرگ ناگہانی بڑھ رہی ہے
 ریشمی کپڑے لپیٹے جا چکے ہیں
 آسماں کا سر خمیدہ ہے

لال پکا

لال پکا اُڑ کے آیا ہے
 بہت ہی دُور سے
 پیغام لایا ہے
 سرائے نور سے
 غٹ غٹ غٹ غٹ غٹ غٹ
 کھول کر دیکھوں
 لکھا ہے کیا خطِ تقدیر میں
 کتنے میگوں کی قید ہے
 کتنی رہائی ہے
 مقدم کون سادہ

کلابہ ٹوٹنے کی دیر ہے
 چرخہ رُکے گا
 زور سے گھومے گا
 پھر تاریخ کا پہیہ
 زمیں پوشاک بدلے گی
 نئی تقویم لکھنے کے لیے کاتب
 سیاہی میں ستارے گھولتا ہے!

ساگر دیوتا

کہو تم کہاں ہو!
 مرکب صداؤں کے ریلے میں
 تم کو پکاروں
 کہ خود کو صداؤں
 عجب نم زدہ سلوٹوں میں گھری زندگی ہے
 زمیں ایک آبی عمل سے گزر کر
 مدور ہوئی ہے
 چٹانوں کے نیچے بھی اندر بھی
 خوابیدہ بل دار آبی چٹانیں
 شب ارتقا کی عجب داستانیں
 بدن کی پہاڑی میں خفتہ

کون سی لیلیٰ شبِ تاخیر ہے
 غم کی خبر ہے یا خوشی کی
 نقشِ حُب ہے یا دمِ تعزیر ہے.....
 مہر کس نے ثبت کی ہے
 کس کی خاتم کا نشان ہے
 کس طلائئِ ہاتھ کی تحریر ہے.....
 حاشیے میں کیا رقم ہے
 کیا نوشتہ ہے مرا اس عالمِ تقصیر میں
 زخمی پروں سے
 ہشت منظر پار کرتا، راس مچکتا
 لال پکا اڑ کے آیا ہے
 بہت ہی دُور سے

بلیو مُون (BLUE MOON)

لمبی پلکیں، آنکھیں گہری
 زلفیں تاریکی کا دھارا
 رات کے دل میں چندن سلگا
 ہار گیا جی لکڑہارا
 راس پہ آئے برج منارے
 چمکا خوب لہو کا پارا
 ملن ملاپ، فراق وچھوڑا
 سال و سن کا کھیل ہے سارا
 چندر جوت جگائے من میں
 کبھی کبھی کا میل نیارا

نمک اور چُونے کی کانیں
 نمی چاٹتے ریگزاروں کی سوکھی زبانیں
 سیہ سنگ آہن رُبا اور سنگ ستارا
 جزیرے ڈھلانیں
 حجر اور جل کھور مٹی کے تودے
 خراطین، پھل، پھول، پودے
 پتاور، ساروغ، تالوس
 جل ناگ، سیلا (Scylla)
 شکن دار اصداف، سرطان، کچھوے
 سمک اور بگلے.....
 مگر تم کہاں ہو!
 تمہیں ڈھونڈتے ہیں مرے خواب کب سے
 میں صدیوں کے ساحل پہ تنہا
 تمہارے جنم رُوپ، سارُوپ کا منتظر ہوں
 مجھے پھر سے وہ زندگی دو
 جسے میں نے اپنے بدن سے جدا کر دیا تھا
 زمینوں، زمانوں کی خواہش سے آگے
 فقط ایک آبی ردا کر دیا تھا.....!

نیلے چاند کا جادو پھیلا
 مور چکور نے پنکھ پسارا
 نیلی جھیل پہاڑ کنارے
 نیلا حوض، مکان، اُسارا
 نیلی چھت پر نیلے پنچھی
 نیلا تھال، گلوب، غبارا
 پورنماس کا جوگ ملا ہے
 ایک مہینے میں دوبارا
 وصل وصال کے بیچ نہ آئے
 صبح کا سورج، شام کا تارا
 آج میں تجھ کو کامل دیکھوں
 تو بھی مجھ کو دیکھے سارا

ابعدیت

ایک ہی جانب چلتے چلتے
 کتنی عمریں بیت گئی ہیں
 دس جہتوں میں کون چلے گا
 بھڑ بھڑ کرتی جسم کی مٹی
 اس آوے میں کون جلے گا
 کوئی محدب کوئی مجتوف
 کس چہرے میں عکس ڈھلے گا
 کھڑکی کے اس پار کا منظر
 یک سمتی کا بہلاوا ہے
 اندر آؤ، غور سے دیکھو

لائٹ کونز (LIGHT CONES)

روشنی کے اس محیط بے کراں میں
 دیکھ سکتا ہوں
 میں ہر اک عکس کی تجرید کو
 موجود سے معدوم ہوتی خواہشِ نادید کو
 اُن گنت روشن مداروں کے جلو میں
 کائناتی عید کو
 فاصلوں میں جذب ہوتے
 دائروں کی پھیلتی اُمید کو
 لوٹ جانا ہے جنہیں انجام سے تمہید کو
 وقت کی تردید کو

اتنی جہتوں کا پھیلاؤ
 دیواروں کا پہناوا ہے
 اب اُس خواب کی چٹنا کیسی
 آنکھیں جس کو دیکھ چکی ہیں!
 اُس جیون کا اقلیدس کیا
 سانسیں جس کو رکھ چکی ہیں!

ایک نقطے پر ہے ماضی، حال، مستقبل کی آنکھ
ارتکا زُور کے مخروط میں
تینوں زمانے آرہے ہیں دید کو.....!!!

سنو بلیک ہول جیسے آدمی!

مجھے تم دُور لگتے ہو
افق کی آخری قوسوں کے بچوں بیچ
اک موہوم سے فلکی جیسے کی طرح
خاموش اور تاریک
اپنی ہی کشش کے دائمی قیدی
کسی بھی دوسرے ذی رُوح کے
احساس سے عاری
بہت بھاری.....!

خود اپنی کوکھ کے شاداب ریشوں سے
کئی رنگوں کے مخمل، ریشمی موزے، سوئیٹر، ٹوپیاں، کپڑے
گھنی گہری مناجاتیں، دُعائیں مُنتی رہتی ہے

زمین نے خواب دیکھا تھا یہ سوچا تھا
جواں ہو کر

میں جب پھولوں پھلوں کا تو
مری خوشبو سے مہکیں گے تنفس موسموں کے
ذائقے میرے پھلوں کے نام سے منسوب ہوں گے
شاخوں پر دھوپ چمکے گی
پرندے آشیانوں سے نکل کر گیت گائیں گے
پروں کو گدگدائیں گے
محبت کرنے والے خوبرو جوڑے
مری چھاؤں میں بیٹھیں گے
ہمیشہ ساتھ رہنے کے ہرے وعدے
سلگتے سُرخ ہونٹوں کی زمینوں پر اُگائیں گے
مرے بھورے تنے پر
پیار سے اک دوسرے کا نام لکھیں گے

سٹی ہائٹس

زمین نے خواب دیکھا تھا
مجھے پیدا کرے گی، پرورش میری کرے گی
موسموں کی سختیاں، تبدیلیاں برداشت کرنے کا
ہوا سے عہد باندھا تھا
مری خاطر غصیلے بادلوں سے، بارشوں سے دوستی کی تھی

زمین ماں ہے
ہر اک ماں کی طرح
تخلیق سے پہلے ہی بچوں کے لیے
سرسبز خوابوں کی ردائیں مُنتی رہتی ہے

مرے نیجوں سے دھرتی پر
نئے جنگل اُگیں گے، پھیل جائیں گے

مہمان پرندوں کو الوداع

الوداع اے مہمانو! اے پرندو! الوداع!
اگلے برس تک الوداع!
اگلے برس جب تم اڑانوں کے صحیفے لے کے آؤ گے،
تو جھیلوں کے کنارے
ہم تمہارے منتظر ہوں گے
تمہارے خوبصورت نرم نرمیلے پروں کا لمس پاتے ہی
زمین پر پھر محبت لوٹ آئے گی
مگر اگلے برس تک
پانیوں میں
کائی کی موٹی تہوں کا بھی اضافہ ہو چکا ہوگا

زمین ماں ہے، زمیں کا خواب تھا لیکن
زمین زادوں کی آنکھوں میں
فلک بوسی کا پدنا ہے جسے تعبیر ہونا ہے
یہاں اب پارک کے بدلے پلازا اک نیا تعمیر ہونا ہے
زمین مجبور ہے
دُکھ سے مجھے کٹتے ہوئے چپ چاپ تکتی ہے!!

امیگریشن (EMIGRATION)

ہمیں اب سانس لینے کے لیے بھی
دور کے دیسوں کی جانب ہجرتیں کرنی ہیں
اپنے دیس کی مٹی
فضائیں، کھیت، جنگل، شہر، دریا، تھل
ہواداری سے عاری ہو چکے ہیں
ارتقا، تہذیب
نسلوں خاندانوں کی کفالت
اقتصادی بہتری کے خواب
آنکھوں کے افق اوزون سے خالی
پرندوں، تلیوں، پودوں کی پامالی

ہوائیں دھول سے
کالی کثافت کے دھوئیں سے
گرد سے لبریز ہوں گی
کھیت، بیلے، گھاس کے میدان، گھنے جنگل
نئی سڑکوں کی آری سے
کئی ٹکڑوں کی صورت کٹ چکے ہوں گے
شکاری موسموں کی سازشیں بھی تیز ہوں گی
الوداع اے میہمانو! اے پرندو! الوداع!
اگلے برس تک
ہم تمہارے لوٹ آنے کی خوشی کا دکھ منائیں گے!!

ویپ ہولز (WEEP HOLES)

ہمیں دیوار مت سمجھو!
کہ جب دیوار کے پیچھے کی مٹی بھیگ جائے گی
تو ہم بوجھل نمی کا دکھ بہائیں گے!!

ابھی مٹی درختوں کی جڑوں کو چوستی ہے
پانیوں کا دکھ
ابھی دیوار کے پیچھے کی مٹی تک نہیں پہنچا
زمین نے آسمان کا غم زدہ چہرہ نہیں دیکھا
ابھی دیوار کو رونا نہیں آیا!

ہوا پتوں کا رستہ دیکھتی ہے

دلوں میں قحط جذبوں کا
زبوں حالی
پرانا دور پھر سے لوٹ آیا ہے
تلاشِ رزق میں نکلے ہوئے
انسان صدیوں کے تصادم سے گزر کر
اجنبی خطوں میں خوشحالی کے پیچھے بھاگتے ہیں
تیسرے درجے کے شہری ہیں
مگر خوش ہیں
ترقی یافتہ ملکوں کی قومیت بڑا اعزاز ہے
اپنے وطن میں صاف ستھری زندگی ناساز ہے
آلودگی ماحول کی اندر دلوں میں اور ذہنوں میں
سرایت کر چکی ہے
جسم زندہ ہیں ہمارے رُوح لیکن مر چکی ہے
چاہتیں مشروط ہیں زر سے
زوالِ زیست کے آثار پختہ ہیں
محبت اب بڑا کمزور رشتہ ہے.....!!

سفید بادل

سفید بادل عجیب شکلیں بنا رہے ہیں
 وہ ریچھ دیکھو
 وہ ہاتھیوں کی کئی قطاریں
 وہ بوڑھا بابا کوئی کھڑا ہے
 وہ جیسے بچے کئی غباروں سے کھلتے ہوں
 سفید بادل ہوا کے جھولے پہ جھولتے ہیں
 کبھی سمٹتے ہیں رنج و غم سے
 کبھی خوشی سے یہ پھولتے ہیں
 عجب دو گیتی میں ہیں معلق

بے شجر سڑکوں پہ پولی تھین کے خالی لفافے سرسراتے ہیں
 خود اپنے موسموں کا خون پی کر
 لوگ جرثوموں کی صورت پل رہے ہیں
 تابکاری کے الاؤ جل رہے ہیں
 بدنمائی کے دھوئیں سے
 پھول کالے تلیوں کے پرسلیٹی ہو چکے ہیں
 خواب کا چہرہ
 دباؤ سے بگڑ کر ٹوٹ جائے گا
 نمی کو راستہ دو!
 درد کے بادل برسے دو!!
 زمیں پر آسماں کا دکھ اترنے دو!!
 ہمیں دیوار مت سمجھو!
 ہمیں بیکار مت سمجھو!!
 کہ جب دیوار کے پیچھے کی مٹی بھیگ جائے گی
 تو ہم بوجھل نمی کا دکھ بہائیں گے
 ہماری آنکھ میں آنسو نہیں خوابوں کی کیچڑ ہے!!!

نہ آسماں کو نہ اس زمیں کو یہ بھولتے ہیں

سفید بادل ازل سے یوں ہی بھٹک رہے ہیں

سُنا رہے ہیں، عجیب قصے

عظیم کہنہ عمارتوں میں

قدیم رُوحوں کا اک جہاں تھا

بس ایک سیال روشنی تھی

بس ایک منظر دُھواں دُھواں تھا

رُکا ہوا سا کئی زمانوں کا کارواں تھا

سفید بادل سیاہ دھبوں میں ڈھل رہے ہیں

افق پہ طوفاں مچل رہے ہیں

زمیں کے اوپر زمیں کے نیچے

ہزار باروگ پل رہے ہیں

سفید بادل دلوں کے اندر اتر رہے ہیں

رگوں میں بہتے پلازما میں اُچھل رہے ہیں !!

درِ ناواپسی

یہاں سے وہ گزرتے تھے

سیہ جسموں میں صدیوں کا

چلن ڈھالے ہوئے، حبشی

سمندر کی طرف کھلتا یہ دروازہ

(درِ ناواپسی گویا)

غلامی کے جہانِ نو کا رستہ تھا

جہاں سے واپسی

آبی جہازوں میں لدے ڈھانچوں

کی آنکھوں میں

فقط اک خواب کی صورت چمکتی تھی

سرِ ساحل یہ دروازہ

یہاں سے اب عقیدت سے

گزرتے ہیں سفید آقا

خود اپنے جبر کا دورِ عقوبت یاد کرتے ہیں

مگر یہ بھول جاتے ہیں

کہ افریقہ

”نئی دُنیا“ کا سورج بن کے اُبھرے گا!!

دیکھ سکتے ہو تو دیکھو!

دیکھ سکتے ہو تو دیکھو غور سے

ویرانیاں تاریخ کی.....!

مقدونیہ کی سمت جاتے راستوں پر دھول اُڑتی ہے

مقدّر کے سکندر جا چکے ہیں

قونیہ کی میخ کے چاروں طرف گنڈل بنائے

گھومتے قدموں کی چاپیں

اب کسی بے وقت لمحے کی صدائے جاں گزا ہیں

اب کسی درویش کی ایڑی میں دم باقی نہیں

روشن لکیریں بجھ چکی ہیں

محو ہوتے جا رہے ہیں

تاریخ سے باہر ایک آدمی

دنوں کے گرد آلودہ جھرو کے سے
میں اُس کو دیکھتا ہوں
چھت کے اوپر
تار پر پھیلے ہوئے کپڑوں کے پیچھے
بے صدا پر چھائیوں کے ڈھیر میں تبدیل ہوتے
اور نیچے
درد کی گلیوں میں
قدموں سے لپٹتی دھول ہے
تاریخ چلتی ہے
دھمک سے کہنہ دیواریں لرزتی ہیں

قص کے سب سلسلے
بغداد پر چیلیں جھپٹتی ہیں
مشقی دھات کے
پھل دار ہتھیاروں کی دھاریں کند ہیں

دیکھ سکتے ہیں تو دیکھو!
اب تمہارے خواب کی گہرائیوں میں
دل دھڑکنے کی بجائے
بس بھری آنکھوں کے جنگل پھلتے جاتے ہیں
کو رتھی ستونوں سے بنی کہنہ عمارت میں
نئی دنیا کے دھاری دار سانپوں کا بسیرا ہے
طلسمی غار میں
خفیہ خزانے کے پرانے آہنی صندوقچوں میں
سرخ سکو کی جگہ ڈال رہے ہیں
دیکھ سکتے ہو تو دیکھو غور سے.....

میں اُس کو دیکھتا ہوں
 تار کو لی راستوں پر
 دھوپ سے بچنے کی خاطر
 ٹین کے چھتوں کے نیچے
 یا کبھی شاموں کے کم گہرے اندھیرے میں
 کتابوں کی دکانوں پر.....!!

گزر تا وقت سنگ و خشت سے آنکھیں رگڑتا ہے
 دنوں کے گرد آلودہ جھروکے سے
 کوئی لمحہ
 پلستر کا کوئی ٹکڑا اکھڑتا ہے
 بدک کرا سپ شاہی بھاگ اٹھتا ہے
 دریچوں اور دروازوں کی درزوں سے
 کئی چینی نکلتی ہیں
 منڈیریں کانپ جاتی ہیں

دنوں کے گرد آلودہ جھروکے سے
 میں اُس کو دیکھتا ہوں
 سر جھکائے بے خبر چلتے ہوئے
 لشکر کے پیچوں بیچ
 بوسیدہ قبا پہنے
 غلاموں کے ہجوم نامشخص میں.....

دنوں کے گرد آلودہ جھروکے سے

آب سراب سی ناریں
 رُوپ کی جوت جگائیں
 دُھوپ کے چھاج اڑائیں
 بوڑھیاں مل جل بیٹھیں
 بھر بھر بھانڈے پھوڑیں
 بادل رُخ نہیں موڑیں
 شیر جوان نمانے
 اپنی کھال جلائیں
 بارش کیسے لائیں.....؟

موسیقار ، گویے
 برکھا راگ الاپیں
 شاعر شعر سنائیں
 پیر فقیر، سوالی
 رقص، دھما، قوالی
 درگاہ، مزار، قبور
 لنگر، دیکیں، ڈالی
 وجد میں سات دِشائیں

بارش کیسے لائیں؟

جھیلیں ہو گئیں خالی
 سوکھے جنگل بیلے
 پنچھی، ڈھور، درندے
 تتلیاں، سانپ، مکوڑے
 انساں زندہ ڈھانچے
 جل بن درد کے سانچے
 آنکھیں خشک دراڑیں
 بنجر خواب سرائیں
 بارش کیسے لائیں.....؟

بصارت کا قحط

زمیں زادے!
 تجھے تو کچھ دکھائی بھی نہیں دیتا
 سقاوہ کب سے خالی ہے
 نہ اوپر ابر باراں ہے
 نہ اب زیر زمیں
 آبِ بقا ہے
 عالمِ فطرات غائب ہے
 نباتاتی تبسم کھو گیا ہے
 تابکاری خواہشوں کا بول بالا ہے
 رگوں میں ریگ ماہی، سانپ، بچھو ریگتے ہیں

بادل کھل کھل جائیں
 بارش کیسے لائیں.....؟

نذر نیاز، چڑھاوے
 ورد، نماز، وظیفے
 آشا، خواہش، ہوکا
 کچھ بھی کام نہ آوے
 دل میں ہو جب سوکا
 مانگیں لاکھ دُعائیں
 بارش کیسے لائیں.....؟
 بارش کیسے لائیں.....؟

ایک نیا اطلانتہ گم ہونے والا ہے

سامنے ڈیال کے قصبے میں
رات انوکھے منظر لے کر آتی ہے
برقی روشنیوں کی خوابیدہ جھلمل سے
منگلا جھیل کے پانی پر
اک مُردہ شہر اُبھرنے لگتا ہے
کچی پکی، تنگ مگر آباد گھروں تک جاتی
بھول بھلیوں جیسی گلیوں میں اُلجھے
مٹی، گارے اور پتھر کے مکانوں میں
جسموں کے ڈھانچے
چلتے پھرتے باتیں کرتے

طائر زریں سلگتی دھوپ پھیلاتا ہوا
اپنے ہدف کی سمت اڑتا ہے
نظر کے آئے بے آب ہیں
اندر زبوں حالی ہے
باہر خشک سالی ہے
یہوست ہی یہوست ہے
خجالت ہی خجالت ہے
زمین سے کیا یہی تیری محبت ہے؟

قرب و جوار کی چیزوں کو
 یک ٹک گھورتا رہتا ہے
 اپنے آپ میں چپکے چپکے شوکتا، پھیلتا رہتا ہے
 اور اب تو مضبوط کناروں، پشتوں سے اُونچا اُٹھ کر
 نوآباد مگر از خود رفتہ میرپور شہر کی حد میں
 داخل ہونے والا ہے

دیکھتے دیکھتے
 یوں لگتا ہے جیسے
 جھیل مرے گھر کے ٹیرس تک آ پہنچی ہے
 مچھلیاں، جونکیں، کیکڑے، کچھوے
 آبی میمل، مینڈک، کینچوے
 میرے بدن پر رینگ رہے ہیں
 کانوں، آنکھوں اور حلق میں
 چھوٹی چھوٹی جل تو ریاں گھس آئی ہیں
 نتھنے..... گھاس کے لچھوں
 کائی کے چٹھوں
 اور ہرے جالوں سے

صاف دکھائی دیتے ہیں
 صبح تلک رُوحوں کی
 سرگوشیوں اور نوحوں جیسے
 بے آواز مگر گونجیلے
 گیت سنائی دیتے ہیں
 پھر دھوپ نکلتے ہی
 جھیل کا پانی

نیچے تہہ میں جا کر سو جاتا ہے
 ریت اور مٹی کی ازلی قربت میں کھو جاتا ہے
 مُردہ شہر بھی آبی قبروں میں گم ہو جاتا ہے

کچھ مدت سے لیکن
 دیکھ رہا ہوں
 منظر بدلا بدلا سا ہے
 جھیل بہت نیچے تھی جو
 اُوپر اُٹھ آئی ہے
 تہہ میں سونے والا پانی
 دن بھر جاگتا رہتا ہے

آگ، ہوا اور مٹی سے
توڑ کے سارے ناتے
رُوحیں اور تہذیبیں
پانی میں چھپ جاتی ہیں!!

بند ہوئے جاتے ہیں
آبی پریاں، جل مانس اور پرندے گھبرا کر
اپنے اپنے خواب گھروں سے
بھاگ رہے ہیں

گلیاں، سڑکیں، کھجے
پیڑ، پلازے
ہاتھ اٹھائے، نیمر تھا، لوگ، جلوس اور جلے
رنگ برنگے اینٹوں کے گہوارے
کوٹھے اور چوبارے
مال مویشی
اسکول، مساجد، باغیچے
درگاہیں اور مقابر
رفتہ رفتہ

سب کچھ ڈوب رہا ہے
ایک نیا اطلانتہ (Atlantis) گم ہونے والا ہے
جب قبریں ڈوبنے لگ جائیں
تو زندہ شہروں میں موت بسیرا کر لیتی ہے

کون سی سطر کہانی ہے تری
 کون سا باب فسانہ ہے ترا
 کون سی صبح تری منطق ہے
 کون سا علم شبانہ ہے ترا
 کون سی نسل تجھے دیکھے گی
 کون سا عہد زمانہ ہے ترا
 اے مرے خواب کہاں جائے گا؟

اے مرے خواب کہاں جائے گا!

کون سی آنکھ ٹھکانہ ہے ترا
 کون سی نیند بہانہ ہے ترا
 کون سے دل میں اترنا ہے تجھے
 کون سا زخم نشانہ ہے ترا
 کون سا جسم ترا مرقد ہے
 کون سا لمس خزانہ ہے ترا
 خواہشِ مرگ کے سناٹے میں
 کون سا اسم ترانہ ہے ترا
 کس مداوے کی ہے ارداس تجھے
 کون سا روگ پرانا ہے ترا

ذرا آرام کرلو
 پھر سنیں گے داستاں تم سے انوکھی سرزمینوں کی
 ہوا میں تیرتے رنگیں مکانوں کی، مکینوں کی
 پڑاؤ اک جنم کا ہے
 الاؤ تیز ہونے دو
 محبت خیز ہونے دو
 شناسا خواہشوں کی خوشبو میں جلنے لگی ہیں
 اجنبیت..... قربتوں کے لمس میں سرشار
 گم گشتہ زمانے ڈھونڈتی ہے
 زندگی دکھ درد بھی قرونوں پرانے ڈھونڈتی ہے!

اجنبی، کس خواب کی دُنیا سے آئے ہو!

اجنبی، کس خواب کی دُنیا سے آئے ہو؟
 تھکے لگتے ہو

آنکھوں میں کئی صدیوں کی نیندیں جاگتی ہیں
 فاصلوں کی گرد پلکوں پر جمی ہے
 اجنبی! کیسی مسافت سے گزر کر آ رہے ہو
 کون سے دیسوں کے قصے
 درد کی خاموش لے میں گارہے ہو
 دُور سے نزدیک آتے جا رہے ہو
 اجنبی آؤ!

کسی اگلے سفر کی رات سے پہلے

میں اپنی عمر کی ساری اُداسی
ڈھیر کر دوں گا، ترے شفاف قدموں میں!

مجھے اپنی محبت کے سمندر سے
فقط دو چار اشکوں کی رطوبت دے
کہیں سے ٹوٹ کر بکھری ہوئی
اپنی کہانی میں
مجھے اک لفظ لکھنے کی سعادت دے
مجھے وہ خواب چُنے کی اجازت دے
جو بن دیکھے
تری آنکھوں میں بکھرے ہیں

میں اپنا جسم اوڑھے کب سے بیٹھا ہوں
مجھے پہچان، مجھ کو آشنائی دے
مجھے قیدِ بدن سے اب رہائی دے
مجھے لمبی جدائی دے
مجھے اس ہجر لمحے کی بشارت دے
جو ملتا ہے

سفرِ مجھ کو صدائیں دے رہا ہے

مجھے اذنِ سفر دے مہرباں عورت!
میں عمروں کا تھکا ہارا مسافر ہوں.....
تری چھتھناڑ چھاؤں میں
چلا آیا ہوں پل بھر کے لیے
اگلا سفر مجھ کو صدائیں دے رہا ہے
راستے پھر سے مجھے آواز دیتے ہیں!
مجھے اپنے دُکھوں کی بے کرائی سے
نجاتِ کرب کا اک پل.....
فقط اک پل عنایت کر

یہاں تو وہی خواہشِ آب ہے

ہم کہاں مل سکیں گے
یہاں تو وہی ایک خواہش کی اندھی گچھا ہے
کبھی ایک سے دوسرے تک
وہی جسم کی سیمیا ہے
وہی درد کی کیمیا ہے
کہو کن جہانوں پہ دکھ روشنی بن کے اترے گا!

دو وقت کی روٹیاں توڑنے میں
ستارے مرے ہاتھ سے گر گئے تھے
مگر تم تو عمروں کی مٹی کی زرخیزیوں میں

ابد کے اُس کنارے سے
کسی روشن ستارے سے
زمینی خواہشوں سے ماورا کر دے!
مجھے اپنے دکھوں کی انتہا کر دے!!
مرے اگلے سفر کی ابتدا کر دے!!!

مجھے زادِ سفر دے کر
خود اپنے ہاتھ سے رخصت بھی کر
انجان دیسوں کی طرف
اُن منزلوں کی سمت
جن سے راستے کترا کے چلتے ہیں
مجھے جلدی ہے، جانا ہے
ترے ہر درد کا تریاق لانا ہے
فشارِ وقت سے پہلے مجھے واپس بھی آنا ہے
سفرِ آغاز کرنے دے، مجھے اے مہرباں عورت!

بڑی سبز و شاداب تھیں
 خواب در خواب سیراب تھیں
 تم نے کیوں پانیوں کے ارادے نہ سمجھے
 اور اپنی زمینوں کو خاکستری کر لیا
 لا جو ردی زمانے تمہارے بدن کے کناروں پہ دو نیم ہیں!

ہجر کے بانجھ میں بے دُعا زندگی
 شب زدہ معبدوں میں
 اُجالوں کی ضد کر رہی ہے
 چراغِ تمنا کبھی یوں بھی جلتے ہیں
 ہر جالی آنکھوں میں غم کی انوکھی نمی جھلملاتی ہے
 دربارِ دل کے ابد بھیگ جاتے ہیں

(لمحوں کی) محراب کی اوٹ میں
 سر جھکائے کھڑا وقت
 ازلوں سے چپ چاپ
 سانسوں کی آندھی کو روکے ہوئے
 تھک گیا ہے

ابھی چل پڑے گا
 وہی ایک سے دوسرے تک.....
 مگر ہم کہاں مل سکیں گے
 کہ ہم سے بہت پہلے بچھڑے ہوئے
 بے خطا پھر رہے ہیں اسی نارسائی کے نیلاب میں
 خواہشِ آب میں!!

ابد کی سرحدوں سے دُور آگے
 لا جو ردی روشنی سے پیار کرنا ہے
 ترا شہرِ محبت تو مرا پہلا پڑاؤ ہے
 جسے تو آخری منزل سمجھتی ہے
 دلوں کے راستوں پر وہ فقط اک نیم روشن سا الاؤ ہے
 بڑی لمبی مسافت ہے بڑا گہرا یہ گھاؤ ہے
 ابد کے اُس طرف بھی راستے ہی راستے ہیں
 فاصلوں کا ایک نادیدہ بہاؤ ہے
 جسے میں دیکھ سکتا ہوں
 جسے میں چھو بھی سکتا ہوں
 مگر میں تو مسافر ہوں
 ترے شہرِ محبت میں ذرا سی دیر ٹھہروں گا.....

ابد کے اُس طرف بھی فاصلے ہیں

مسافر ہوں
 ترے شہرِ محبت میں ذرا سی دیر ٹھہروں گا
 چلا جاؤں گا اپنے راستے پر
 زندگی کی رات ڈھلنے دے بدن کو مات ہونے دے
 رُکی ہے جو لبوں پر بات ہونے دے
 ترا شہرِ محبت خوب ہے لیکن اسیری کا بہانہ ہے
 ازل کی اولیں ساعت ابد کا آخری لمحہ
 یہیں پر مرتکز سارا زمانہ ہے
 مگر مجھ کو فِصیلِ وقت کے
 ٹھہرے ہوئے اس دائرے کو پار کرنا ہے

لیکن تم تو

نادیدہ زمانوں کے ابد آباد کرتی ہو
کسی دل کو رلاتی ہو کوئی دل شاد کرتی ہو
نہ جانے کون سی ازلوں کے دکھڑے یاد کرتی ہو
کہ عمریں درد کی صدیوں میں ڈھل کر
ایک لمحے کی پذیرائی سے نانا توڑ لیتی ہیں
تمہارے شہر کی ہر سمت سے آگے

سفر ہے بے مرادی کا

کسی منزل کی جانب

خواہشوں کے دو قدم اٹھتے تو ہیں لیکن
زمینوں آسمانوں کے تھکے ماندے شکستہ دل
مسافر راستوں سے لوٹ آتے ہیں.....!!

مسافر راستوں سے لوٹ آتے ہیں

محبت شہر کی وہ سمت ہے
جس سمت میں اے روشنی زادی!
تمہاری رات کے تارے چمکتے ہیں
تلاش خواب میں نکلی ہوئی آنکھیں
کبھی تو آنسوؤں کی دھندلاہٹ میں
خود اپنے گھر کا رستہ بھول جاتی ہیں
اگر میں دل کے زخموں پر
تمہاری چاہتوں کا لمس رکھ دوں گا
تو سارے شہر کے حساس لوگوں کو مسیحا ملی
بے قراروں کو قرار آئے گا

جان کرا ب کیا کرو گے؟

درد کی لے میں

ہوا صدیوں پرانا گیت گاتی ہے

مسافر باد باں کھلنے لگے ہیں

ہجر سر پر ہے

تمہارے خواب کی کشتی

مری آنکھوں کے آبی راستوں میں ڈالتی ہے

کن سوالوں کی گرہ مضبوط کرنے میں لگے ہو تم؟

مجھے اس نیند کے ابدی بہاؤ میں

ذرا سانس اپنی روشنی کا دان کر دو گے

تو میں ساری مسافت کی تھکن کو بھول جاؤں گا

سفر میں راستے کب طے ہوئے تھے

جان کرا ب کیا کرو گے؟

اب جان کر کیا کرو گے؟

سفر میں راستے کب طے ہوئے تھے

فاصلوں کے لا ابد پھیلے گھماؤ میں

ازل سے وقت کا چلنا

دلوں کی دھڑکنوں سے مختلف کتنا ہے

کس لا حاصلی کے جبر میں

بے عمر سانسوں کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے

کہاں تم سے ملے تھے

کون سی منزل پہ ٹھہرے کس پڑاؤ پر کے تھے

کون سے مرکز پہ آ کر

زندگی کی گردشیں تھمنے لگی ہیں

ارض و سما کے روبرو
 ایک تابیدہ تیقن کو مجسم دیکھنے کی جستجو
 لا حاصلی، کارزیاں، امرِ محال
 رینگتی صدیوں، تھکی عمروں کے بوجھل بوجھ میں
 تلملاتے ماہ و سال
 گرد آلودہ مسافت، ہمسفر مفقود ہے
 راستہ بے سمت ہے، مسدود ہے
 اذن سفر کا کیا سوال؟
 اے مرے عکسِ جمال!
 آگہی محدود ہے، تیری ارادت لازوال
 تو ہمیشہ کے لیے ہے
 میں ذرا سالحہ بھر کا اک خیال!!

روشنی، تیرے جنم یگ پر ایک نظم!

تیری اقلیمِ محبت میں رکا ہے
 اک مسافر بے ارادہ بے مجال
 تجھ کو چھو کر
 اصل ہونے کی تمنا میں نڈھال
 خواب کے اندر بکھرتے خواب کا زخمی ملال
 راکھ پر آنکھیں بناتی
 انگلیوں کا بے بصر، اندھا کمال
 دم بدم رنگت بدلتے موسموں کے درمیاں
 پھول کھلتی دھول، ملتی خواہشوں کا اندمال
 بے عبادت بے دُعا

اداسی ہے ”لا“ ہے
 کسی دن اسے کھول کر دیکھنا
 بھڑبھری ریت سارے خلا پاٹ دے گی
 خدا خود سے آزاد ہوگا!
 مجھے یاد ہے
 میرے ہونے کی خواہش میں
 ماں نے فقط آنسوؤں کو دُعاؤں میں شامل کیا تھا
 مگر میں نے پھر بھی
 خوشی اُس کی آنکھوں سے بہتی ہوئی دیکھ لی تھی
 ڈرو مت!
 محبت کے اوقات خود کار بٹنوں کے زیرِ اثر ہیں
 تمہارا جنم روشنی ہے
 مرا خواب گہری گھنی رات میں راستہ بھولتا جا رہا ہے!!

روشنی، تمہارے لیے ایک اداس نظم!

اداسی مجھے لکھ رہی ہے
 خطوں میں، کتابوں میں
 ٹیبل پہ بکھرے ہوئے کاغذوں میں.....
 خدا قید میں ہے
 تمہیں یاد ہے کچھ
 رہائی کی تاریخ کیا ہے؟
 زمیں ایک آنسو ہے مٹی میں گوندھا مہوا
 وقت کی بند مٹھی میں کچھ بھی نہیں ہے
 فقط جسم کی خاک ہے
 نارسائی کا دکھ ہے

شکل بے شکل میں
 اصل بے اصل میں
 شبہی جھاگ میں
 ریشمی آگ میں
 تن کے آزار میں
 من کے اُس پار میں
 عکس بے عکس میں
 عمر کے رقص میں
 عہد بے عہد میں
 انت بے انت میں
 ابتدا انتہا
 لاجوردی خلا
 ہے ازل تا ابد
 جست بھر فاصلہ
 روشنی!.....! روشنی!
 روشنی!.....! روشنی!

رقصِ عمر میں وصال

ہجر کی نیند میں
 وصل کے خواب میں
 خوابِ شب تاب میں
 دکھ کے بے آب میں
 ارض کے چاک پر
 جسم کی خاک پر
 قطرۂ اشک میں
 موجِ افلاک پر
 گندی فصل میں
 نطفۂ نسل میں

تلذذ آشنا بھو کی زبانوں سے
 لہو کی رال ٹپکے گی
 اگر اس خواب کی وحشت سے بچنا ہے
 تو آنکھوں پر سیہ پردے گرا کر
 رات کی تمثیل دیکھو!
 صبح کی تاویل دیکھو!!

اگر اس خواب کی وحشت سے بچنا ہے

اگر اس خواب کی وحشت سے بچنا ہے
 تو آنکھوں پر سیہ پردے گرا کر
 رات کی تمثیل دیکھو!
 روشنی سکرین پر پھیلی اذیت ہے
 محبت بے یقینی کا لبادہ ہے
 اسے اوڑھا

تو ساری عمر اپنی بے لبا سی کا
 تماشا دیکھنا ہوگا
 برہنہ خواب کا منظر بڑا لدوز ہوتا ہے
 ذرا سا ذائقہ تقشیر ہوتے ہی

حصارِ جسم سے باہر ایک گیت

مجھے اپنی نیندوں کا بے خواب حصہ سمجھ لو
 مجھے اپنی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے
 اُن ہے آنسوؤں کا ارادہ سمجھ لو
 مجھے اپنے ہونٹوں پہ کھلتی
 دھنک رنگ خواہش کا بوسہ سمجھ لو
 مجھے اپنے قدموں سے لپٹی مسافت کا رستہ سمجھ لو
 بدن کی صدی میں مجھے ایک لمحہ سمجھ لو
 مجھے اپنے ہونے کا بے شک گماں تک نہ جانو
 مگر اک یقیں کا اعادہ سمجھ لو
 مجھے اپنے اگلے جنم کی محبت کا وعدہ سمجھ لو!!

بگ مارک

جہاں اُس نے پڑھتے ہوئے مجھ کو چھوڑا تھا
 اب تک وہیں ہوں
 کسی نے کتابِ محبت پلٹ کر نہ دیکھی
 زمانہ کہیں کا کہیں جا چکا ہے
 مگر میں ادھوری کہانی میں اُٹکا ہوا
 منتظر ہوں کہ وہ آئے
 آ کر کتابِ محبت کے اوراق پلٹے
 کہانی کو آگے بڑھائے.....!
 اُسے زندگی میں بہت آگے جانے کی خواہش تھی

یادوں کی بوسیدگی کی علامت ہوں
 آدھی محبت کی پاکیزگی کی ندامت ہوں میں بھی
 مقدس صحیفے میں رکھا ہوا
 مور کا پنکھ ہوں
 لذتِ اشک میرا مقدّر نہیں ہے.....!

شہرت، گلیمر سے بھرپور
 اُونچے سہانے دنوں کی تمنا تھی
 عمر گریزاں کی مصروفیت میں
 اُسے پھر سے پڑھنے کی فرصت کہاں تھی
 کتابوں کو الماریوں میں سجا کر
 اُسے بھول جانے کی عادت تھی ویسے بھی
 وہ جانتی تھی
 پرانی کتابوں سے ملتا ہی کیا ہے
 فقط چند سوکھے ہوئے پھول
 بے لمس پتے، مری تتلیاں
 لفظ دیمک کے کھائے ہوئے
 خط بطورِ نشانی چھپائے ہوئے
 نام کچھ دوستوں کے.....!

جہاں اُس نے پڑھتے ہوئے مجھ کو چھوڑا تھا
 اب تک وہیں ہوں
 کہ میں بھی فقط اک نشانی ہوں
 گزرے تعلق کی بھولی کہانی ہوں

سُنْدُس

فقط تین برسوں کی بیٹی مری
 مسکراتے ہوئے دیکھتی ہے
 تو لگتا ہے جیسے
 خدا بھی شرارت بھرے مُوڈ میں ہے
 خدا جواز ل سے ابد تک
 زمانوں جہانوں کی سنجیدگی اور پاکیزگی کا
 بہت خوبصورت سا احساس ہے
 بیٹیوں کے دُکھوں اور خوشیوں کا ہمراز ہے
 بیٹیوں کے محبت بھرے دل کا انداز ہے
 بیٹیوں کی طرح دُور ہے پاس ہے!!

باسٹرڈز (BASTARDS)

محبت کر نہیں سکتے
 وہ دس نسلوں کے اُن چاہے
 جنہیں مائیں
 محبت کے کسی بے عکس لمحے میں
 جنم دیتی ہیں
 لیکن کوکھ سے باہر
 لہو سے جسم کا رشتہ شباہت مانگتا ہے
 دودھیا بو سے
 برہنہ روشنی کے لمس میں لتھڑے ہوئے
 ہونٹوں پہ جب تولید ہوتے ہیں
 تو دس نسلوں سے بے چہرہ پدرزادوں کے نطفے
 چھاتیوں میں منہ چھپاتے ہیں!

شکستِ خواب میں پسپائی

رات
میرے گرد
گھیرا تنگ کرتی جا رہی ہے
اور میں..... تنہا
فصیلِ خواب کے اندر
سمتا جا رہا ہوں.....!

میرے ہاتھ مری آنکھیں ہیں

میرے ہاتھ مری آنکھیں ہیں
تم ان پر دھوپ اور چھاؤں کے
سارے منظر لکھ سکتی ہو
بینائی کا لمس بدن کے ہر موسم میں کھلتا ہے
دیکھنے والے ہاتھ
کسی خوش قسمت کی جانب اٹھتے ہیں
دوست، انھیں بے توقیر نہیں کرتے
تھام لیا کرتے ہیں!!

بے کراں دُکھ کی مسافت

بے کراں دُکھ کی مسافت میں
اگر ہم ساتھ چلتے بھی
تو کیا ہوتا
کہ عمروں کے تسلسل میں
ہمارے خواب زنجیروں کے حلقے ہیں
جنہیں ہم توڑ سکتے ہیں نہ جن کو چھوڑ سکتے ہیں!

بے کراں دُکھ کی مسافت میں
مسافرات کے اتم کنارے دُھونڈتے ہیں
میں ادھورے گیت کی لے پر

بلیک وڈو (BLACK WIDOW)

کسی تاریک گوشے میں
وہ اپنا عنکبوتی جال بُنتی ہے
چمکتا آبنوی جسم اُس کا
زہر سے لبریز ہوتا ہے
وہ جس کے ساتھ بھی ہم خواب ہوتی ہے
دَمِ وصلت
اُسے کھا کھا کے زندہ مار دیتی ہے

خود اپنے دل کی دھڑکن گنگنا تا ہوں
 تمہارے خواب کی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی ہیں
 مگر ان بے پروا راستوں میں
 کون جانے
 روشنی گھاؤ ہے دل کی منزلوں کا
 وقت گوتم ہے
 کئی صدیوں کی سرگم ہے
 زمیں اک لاغر و بیمار خلیے کی ولادت ہے!

بے کراں دکھ کی مسافت میں
 ابھی تم بے خبر ہو
 درد کی بے انت راتوں سے
 کبھی جب شام کے باغوں میں سورج ڈوب جائے گا
 تو میں آؤں گا
 تاریکی کے خیمے میں
 جہاں تم آخری سانسوں کی گنتی میں
 مرے بے زانچہ ہاتھوں کا بوڑھا لمس پا کر
 چونک جاؤ گے

تمہاری نم زدہ آنکھوں سے
 میری عمر کے سوکھے کنارے بھیگ جائیں گے
 اُداسی کے ابد پر ہم ملیں گے
 اور سارے بھیگ جائیں گے.....!!

پہنے رہو، خوگ ہوگا
 (جھیل کا) پانی محبت ہے
 ہوا کا لمس سچا ہے
 اسے شب خیز یادوں کی طرح
 دل میں اترنے دو
 نمی محسوس ہونے دو
 تلاشِ وصل کے مارو!
 کبھی بے موت مرنے کی تمنا بھی نہ کرنا
 اس ڈگر میں
 روشنی آسب ہے، مرگِ تمنا ہے
 فریبِ جستجو ہے
 اُروشی نے سچ کہا تھا
 عورتوں کا ساتھ دائم رہ نہیں سکتا!!

اُروشی: گندھرو کی اپسرا

اُروشی نے سچ کہا تھا!

اُروشی نے سچ کہا تھا
 عورتوں کا ساتھ دائم رہ نہیں سکتا
 برہنہ خواب کی تلخیص
 شب کی تیرگی ہے
 کیا خبر کب میمنوں کے رُوپ میں وہ
 چھین لیں آ کر لباسِ جسم کی پوشیدگی
 نادیدہ منظر کا تماشا دیدنی ہوتا ہے لیکن
 روشنی میں اپسرائیں
 اپنی دنیاؤں کی جانب لوٹ جاتی ہیں
 اندھیرا مرد کی پوشاک ہے

مجنوب خواہش کا خمیازہ

تباشری دنوں میں وہ
خود اپنے رُوپ کا بہروپ لگتا ہے
پڑا رہتا ہے چپ اوڑھے
اسے جب بھوک لگتی ہے
تو یادوں کے سڑے سوکھے نوالے
توڑتا اور پھانک لیتا ہے
سانس لیتا ہے
تویوں لگتا ہے جیسے اُس کے سینے میں
سمندر بھاپ بن کر اڑ رہا ہو
دُھوپ لگتی ہے

تو تن کی لُستی، تپتی زمیں پر
شب کی چادر تان لیتا ہے
وہ گہری نیند میں بھی جا گئے کا ورد کرتا
خواب جیتا ہے
انوکھے بدمزہ سے خواب
پلکوں کے گھنے جنگل میں
ٹپ ٹپ بارشوں کا راگ سنتا ہے
اچانک دُھوپ میں لت پت کوئی منظر گزرتا ہے
تو آنکھیں میچ لیتا ہے
سبھی کہتے ہیں
ایسا تو نہیں تھا وہ
مگر اُس نے
کسی مجنوب عورت کی طرف
شہوت بھری نظروں سے دیکھا تھا!

کچھ کتبوں پر نام نہیں ہوتے!!

عورت اور خدا میں یکتائی کا رشتہ ہے
بے اشک اُداسی کے

انت سرے پر

جب تم دُکھ سے ہنستی ہو..... تو

میرے ساتھ خدا بھی رونے لگتا ہے
کیا تم اپنے لمس میں بھیگی بکھری نظمیں
بادل اور ہوا کے پُر زوں پر لکھ سکتی ہو؟

بارش کے موسم میں

آ نسو گننا کتنا مشکل ہوتا ہے

جس مٹی سے تم لفظ بناتی ہو

وہ میری رُوح کا اُترن ہے

میں نے اپنے جسم میں جینا چھوڑ دیا ہے!

کچھ کتبوں پر نام نہیں ہوتے!

کیا تم خاموشی سُن سکتی ہو؟

میں نے تنہائی کو چلتے دیکھا ہے

سوکھے پتوں کی طرح

چُر مُر خوابوں کے رستوں پر!

کچھ منظر آنکھوں کے پیچھے ہوتے ہیں

جن کو عد سے دیکھ نہیں سکتے

جو تحریر نہیں ہو پاتے

وہ کس عہد کا قصہ بنتے ہیں؟

اور دلوں پر کندہ..... خواہش کی شکلیں

کون پڑھے گا؟

تُو ہر تہذیب کا حصہ ہے
 تُو ہر دور کا قصہ ہے
 صدیوں کی امانت ہے
 زمیں پر پیار کی پہلی بشارت ہے
 خدا کا گیت ہے
 ہر عہد کی عورت ہے تُو..... لیکن
 تجھے کس عہد میں ڈھونڈوں؟

تجھے کس عہد میں ڈھونڈوں؟

تُو قرون کی اساطیری محبت ہے
 قدیمی معبدوں کے غم زدہ اسرار
 تیرے جسم کے حیرت کدے سے جھانکتے ہیں
 اپنی جانب کھینچتے، آواز دیتے ہیں!
 مسافر تیری آنکھوں میں
 سفر کے خواب رکھتے ہیں تو رستہ بھول جاتے ہیں!!
 ہڑپہ، موہنجوداڑو، ٹیکسلا
 یونان کے دانش کدوں
 اور نیل کے صحراؤں میں
 گزرے زمانوں اور آنے والی عمروں میں

کائناتی دائرے تصلیب کرتی ہے
 کبھی لفظوں کے بلے سے بھی سامانِ سفر ملتا ہے
 میری جاں!
 کہانی ٹوٹ کر مربوط ہوتی ہے
 محبت زندگی کا آخری ہتھیار ہے
 لڑتے ہوئے مرنا بہت آسان ہوتا ہے!!

کہانی ٹوٹ کر مربوط ہوتی ہے!

محبت جسم کے بستر پہ سوتی ہے
 دکھی عورت خدا کا روپ ہوتی ہے
 جو راتیں جاگتی ہے، نیند روتی ہے
 تکوئی خواہشیں
 تکمیل کے کن زویوں کو ڈھونڈتی ہیں؟
 روشنی کا لمس
 بوسوں کی عبادت ہے
 سلگتی ریت کی پابستگی
 چھاؤں میں چلنے سے کہیں بہتر ہے
 مخروطی اذیت

ہم نے کب تجھ کو یاد کیا!

گرد نامہ

کب مٹی کے زخم بھرے
کب دکھ کی تجسیم ہوئی
کب آنکھوں کی عریانی کو
جسموں کا ملبوس ملا
کب آئینہ خانوں میں
عکس بے تقسیم ہوئی
کب ایک چھنا کے سے
لمحے کا دل ٹوٹا
صدیوں کی زنجیر بنی
کب روشنیوں کے پھول کھلے

چلے آؤ
جہاں بھی ہو
تمھاری یاد خوشبو کی طرح
گھر کے ہر اک گوشے میں پھیلی ہے
اُسارے کے ستونوں سے
دُعاؤں کے مربع کاغذی ٹکڑے
اور آنگن کے درختوں پر
تمھارے نام کے تعویذ چسپاں ہیں!

رنگوں سے تصویر بنی
 کب قرنوں کی خاموشی کو
 آوازوں کا اذن ملا
 لفظ بنے، تفہیم ہوئی
 کب سانسوں کی مدھم لے پر
 تلواریں کا رقص ہوا
 نیزوں پہ سر گھوم گئے
 رسم وفا تبدیل ہوئی
 کب یہ دسترخوان سجے
 زیتون، پییر اور نان سجے
 کب نیند کے میدانوں میں
 خوابوں کا اک شہر بسا
 کب قدموں کی چاپ اُبھری
 دل کا دروازہ کھلا
 کب یادوں کے لشکر گزرے
 عمریں پامال ہوئیں
 کب تاریخ کا پہیہ گھوما
 نسلیں بے حال ہوئیں

اپنے اپنے حال کے قیدی
 ہم اک ازلی جال کے قیدی
 ہم کیا جانیں تُو نے کیسا
 گھیر گھمایا، چکر باندھا
 کون ابد آباد کیا
 ہم نے کب تجھ کو یاد کیا!
 کب ہم نے تجھ کو یاد کیا!!

خوابوں کی تجسیم کہاں ہوتی ہے!
 سایوں سے ہم بستر صبحیں
 کب سورج کو جنم دے سکتی ہیں!
 ان کو خبر ہے
 ہم اپنی تھل تھل کرتی آنکھیں
 گہرائی اور پایابی کے بیچ کہیں
 دکھ کی ازلی دلدل میں پھینک آئے ہیں
 وہ جان چکے ہیں
 ہاں وہ جان چکے ہیں
 سمجھوتے کرنے والے
 ان کو زیر نہیں کر سکتے
 ان کی ضرورت بن کر جی سکتے ہیں
 اپنی مرضی سے نہیں مر سکتے
 رستہ چھوڑ کے چلنے والے
 واپس کب جاسکتے ہیں.....!

پسپائی

وہ جان چکے ہیں
 سمجھوتوں کی ذلت لے کر
 ہم اب پسپائی کے سفر میں ہیں
 ان کو پتا ہے
 ڈھلوانوں سے لڑھکے پتھر
 کب رکتے ہیں!
 اک بار نشیبوں میں گر جانے والے
 کب اوپر اٹھ سکتے ہیں!
 ان کو ہمارے خواب انوکھے لگتے ہیں
 لیکن یہ معلوم ہے ان کو

اُن کہی ہو
 بات جس کی خامشی آواز ہو
 ایسی انوکھی بات ہو جس پر
 زمیں بھی حیرتی ہو
 آسماں نیلے تحیر سے ہمیں دیکھے
 ہوا سرگوشیاں اپنی بھلا ڈالے!

چلو اک نظم لکھیں
 اور لکھ کر بھول جائیں.....
 زندگی بھر بھول جانے کی سزا پائیں!!

چلو اک خواب دیکھیں!

چلو اک خواب دیکھیں
 خواب سچی دوستی کا
 دُکھ میں بھیگی سرخوشی کا
 روشنی کا، آگہی کا
 اور دلوں کے درمیاں پھیلی
 اذیت سے رہائی کا
 ملن کا اور جدائی کا!

چلو اک بات سوچیں
 بات جو بالکل نئی ہو

جل تھل جل تھل بھیگیں گے
اور خدا کے ہونٹوں سے
نغمہ بن کر پھوٹیں گے

اگلے جنم میں.....
فاتح بن کر
اُس شہر میں اتریں گے
جس شہر کی گلیوں میں
طوقِ ندامت پہنے
قیدی جسموں کا بوجھ اٹھائے
ہم نے کسی پچھلے جنم کا
جیون بھوگا ہے

اگلے جنم میں.....
مرنے سے پہلے ہم
زندہ رہنے دُکھ سہنے کی
جنگ لڑیں گے!

جنم جنم کا گیت

اگلے جنم میں.....
ہم تم مل کر
ان رستوں سے گزریں گے
جن پر چلنے کی خواہش
دریا پار اترتے ہی
پانی میں بہہ جاتی ہے

اگلے جنم میں.....
ہم تم دونوں
ایک محبت کی بے موسم بارش میں

بڑھا پا پھیل جاتا ہے
یہاں جو لوگ ہیں
صدیوں کے پسپائی
تھکے ہارے پیادے ہیں
جنہیں تاریخ لکھنا بھول جاتی ہے!

تیسری دُنیا

یہاں جو رات ہے
عمروں سے لمبی ہے
یہاں جو خواب ہیں
آنکھوں سے اوجھل ہیں
یہاں جو زخم ہیں
باتوں سے گہرے ہیں
یہاں جو سانس ہے
اک تیز آری ہے
جو ہر دم کاٹتی رہتی ہے سینوں کو
یہاں نوزائیدہ بچوں کے چہروں پر

گدلے آنسوؤں کا زہر
آنکھوں میں سلگتی، ادھ بجھی نیندیں
تھکن سے چور بدنوں کی بساوت
خواب گاہوں کی برودت
فاصلوں کے ساتھ لپٹی قربتوں کا قہر ہے
دُور تک بہتی سڑک
آبنائے شہر ہے.....

وقت کی بدرو میں گرتے خواب

دُور تک بہتی سڑک
آبنائے شہر ہے.....
ہوٹلوں، شاپنگ پلازوں، پارکوں میں
خوشنما چہروں کا اک سیل رواں
کولون کی خوشبو
لکیریں، دائرے، قوسیں بناتی
زاویہ درزاویہ ملبوس جسموں کی ثقافت
تارکولی خواہشیں
تیزاب رشتے
وقت کی بدرو میں گرتے خواب

غبارہ

غبارے کے پیچھے
 بہت دُور بھاگا
 مگر تھک گیا وہ
 غبارہ ہوا سے بھرا تھا
 حقیقت میں لیکن ہوا سے بھی ہلکا تھا
 اُڑتا ہوا
 بادلوں سے بھی اُوپر نکلتا چلا جا رہا تھا
 ذرا دیر میں پھر
 نگاہوں کی حد سے بھی اوجھل ہوا تھا
 مگر اپنی معصوم سوچوں کی چھت پر

ابھی تک
 وہ نادیدہ دھاگے کو تھامے کھڑا ہے
 زمیں اک غبارے کی صورت
 خلا میں اُڑی جا رہی ہے!

بہت سے لوگ ہیں جن کو
 ابھی دل گیر ہونا ہے
 بہت سے ہاتھ ہیں جن کو
 ابھی زنجیر ہونا ہے
 بہت سے سائل ہیں جس کو
 ابھی کشمیر ہونا ہے
 بہت سے لفظ ہیں جن کو
 ابھی تسطیر ہونا ہے!

تسطیر

بہت سے خواب ہیں جن کو
 ابھی تعبیر ہونا ہے
 بہت سے رنگ ہیں جن کو
 ابھی تصویر ہونا ہے
 بہت سے عکس ہیں جن کو
 ابھی شب گیر ہونا ہے
 بہت سے درد ہیں جن کو
 دلوں میں تیر ہونا ہے
 بہت سے اشک ہیں جن کو
 ابھی تقطیر ہونا ہے

سمندر کشتیاں، جل چے
 جزیرے، دل لیں، سُرخاب میرے ہیں
 سبھی آنکھیں
 سبھی چہرے
 سبھی پایاب میرے ہیں!
 یہاں سب خواب میرے ہیں!!

POSSESSOR

یہاں سب خواب میرے ہیں
 گلی میں کھیتے بچے
 زمیں پر ریگتے کیڑے
 پرندے، تتلیاں، پودے
 ہوا میں تیرتے بادل
 ندی نالوں کا پانی
 آبشاریں
 سب پہاڑی سلسلے
 میدان، جنگل، کھیت، دریا
 راستے، صحرا

محبت جب بھی روتی ہے
 سمندر پھیل جاتے ہیں
 کنارے ڈوب جاتے ہیں
 محبت جب بھی سوتی ہے
 کسی عورت کے بستر میں
 بڑی گہری گھنی نیندیں
 بدن پر اوڑھ لیتی ہے
 محبت جب بھی مَرتی ہے
 ابد کی موت مَرتی ہے

محبت

محبت جب بھی ہوتی ہے
 ستارہ وار ہوتی ہے
 بساطِ وقت سے باہر
 ابد کے پار ہوتی ہے
 محبت جب بھی ہنستی ہے
 کہیں بجلی چمکتی ہے
 کہیں بادل برستے ہیں
 ہوا نظمیں سناتی ہے
 زمیں پر پھول کھلتے ہیں
 پرندے لوٹ آتے ہیں

زیر کرتا جا رہا تھا
میں بھی چُپ تھا
جانتا تھا
کچھ کہا تو روپڑوں گا

لاؤنج میں بیٹھے ہوئے
اجنبی دیسوں کے باشندے
مرے چاروں طرف
آہستگی سے
ہم کلامی میں لگے تھے
مجھ کو لگتا تھا کہ جیسے
اپنی اپنی بولیوں میں رو رہے تھے
(گو بظاہر ہنس رہے تھے)

گیٹ ٹونٹی فور سے
بونگ سیون فور سیون کی طرف جاتے ہوئے
میں نے دیکھا
وہ اگرچہ جاچکا تھا

گیٹ-۲۴

لاؤنج سے باہر مجھے
الوداع کہتے ہوئے
میں نے دیکھا
اُس کی آنکھوں میں اُمنڈتے بادلوں کے باوجود
دُھوپ کی چھننا رہتا تھی

وہ اگرچہ شانت تھا
لیکن مجھے معلوم تھا
گہری اُداسی کا تموج
اُس کے سینے کے چٹانی ساحلوں کو

چالیسویں سالگرہ پر ایک غیر رسمی نظم

عمر کی پختہ ٹیبل پر
جو بیت گئے اُن برسوں کے
کچے برتن
بے ترتیب پڑے ہیں
آنکھوں کی پلیٹوں میں
خوابوں کے گول سنہری
کیک سجے ہیں
دھیان کی خالی چینک سے
قطرہ قطرہ
یادوں کی چائے گرتی ہے

لیکن اُس کی اُن گنت بھیگی ہوئی پرچھائیاں
لاؤنج کے شیشوں سے چپکلی رہ گئی تھیں

اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے
سارے مسافر ہنس رہے تھے
میں اکیلا رو رہا تھا!

دُکھ تو سارے میرے تھے!

خواب اگر ہم زندہ رکھتے
تعبیروں کی اُمید بھی ہوتی!
اب تو ایک ادھوری نیند کے جگراتے میں
تنہائی کا فرغل پہنے
سرد اُدا سی اوڑھے رستوں پر چلنا ہے

جیون لکھتے لکھتے
کتنی نظمیں بیت گئیں
عمروں کی خاموشی میں
لفظوں کی سرگوشی میں

دُور..... خلائی روشنیوں کے
بے آب سمندر میں
چالیس ستارے ڈوبتے ہیں
میری پڑوسن تنہائی
جذبات کی آگ میں جلتا
سرخ مائل سورج
اور خواب دھنک میں لپٹی
اُس کی ہم رقص سلونی شام
میرے معزز مہمان
تینوں مل کر گاتے ہیں
”پپی برتھ ڈے ٹو یو!“
پپی برتھ ڈے ٹو یو!“
اور میں، چوتھا مفرد
سینے کے بے انت خلا میں
سانسوں کے خالی ٹین بجاتا ہوں
اپنے ہونے کا جشن مناتا ہوں!!

(یکم اپریل ۱۹۹۴ء)

سب حرف ہمارے (ناموں کے) ہار گئے
لمحہ لمحہ اُکلاتی سانسیں جیت گئیں

میرے لیے تم
صحرا کے عین سرے پر
سبز پہاڑی کا خاکہ تھیں
ریت سے گھائل آنکھوں میں
دھندلا سا اک چہرہ تھیں
دھوپ میں ڈھلتا سایہ تھیں

برسوں بعد تمھارا
ایک پرانا خط پڑھ کر
سوچ رہا ہوں
دُکھ تو سارے میرے تھے!
رشتوں کے بے نام سفر میں
ایک انجانے موڑ پہ آ کر
اپنی چُپ کی بات سنا کر
تم کیوں اتنا روئی تھیں؟

خواب کا چہرہ نہیں ہوتا

خواب کا چہرہ نہیں ہوتا
فقط آنکھیں ہی ہوتی ہیں
مگر آنکھوں میں چہروں کی عجب اک بھیڑ ہوتی ہے
کہ جس میں خواب رستہ بھول جاتے ہیں!

کرب سمجھوتوں کا
اندر کے سہانے موسموں کو
زرد کرتا ہے
بجھا دیتا ہے جذبوں کے الاؤ،
خوبصورت منظروں پر

برف زاروں کی اُداسی تھوپ دیتا ہے
ہوا کا عکس اُتھلے پانیوں میں ڈوب جاتا ہے!

نظمیں زندہ رہتی ہیں!

گھر سے اسکول کے رستے میں
مستقبل کے خواب اُٹھائے بستے میں
بچے..... بوڑھے ہو جاتے ہیں
ننھی منی، تتلیوں جیسی
باتیں زندہ رہتی ہیں!

خوابوں اور تعبیروں والے
روشن ہاتھوں اور لکیروں والے
نقدیروں والے
لوگ کچھڑ جاتے ہیں

روح کا آزار
جسموں کی شناسا تختیوں پر
اجنبیت کی لکیریں کھینچ دیتا ہے
لبوں پر مسکراہٹ پینٹ کرنے سے
دُکھوں کا ذائقہ شیریں نہیں ہوتا!

درد کے ساحل پہ بیٹھی
عمر بھر کیا ریت سے ڈرتی رہو گی؟
ریت کی مٹھی
سمندر پاٹ سکتی ہے
نہ آنکھوں میں چمکتے پانیوں کو جذب کرتی ہے!

جانتی ہو؟
نیند میں چلتے ہوئے جاگا نہیں کرتے.....!

یادیں زندہ رہتی ہیں!

شاموں کی تنہائی میں
سر پھوڑتی بینائی میں
منظر کجلا جاتے ہیں
خوابوں کی طرح دُھندلا جاتے ہیں
رستہ دیکھنے والی
آنکھیں زندہ رہتی ہیں!

ردی کاغذ پر لکھنے والے
شاعر مر جاتے ہیں
نظمیں زندہ رہتی ہیں!